© rasailojaraid.com

باہمی تلازم کے بنیادی اصول کے عین مطابق ہے اور یہ اصول بجائے خود قرآن سے ماخوذ و مستفاد ہے۔ ہر تفسیر کا ایک مرکزی خیال ضرور ہوتا ہے اور ہر مرکزی خیال کی کوئی نہ کوئی مرکزی اساس بھی ضرور ہوتی ہے۔ ہمیں مولانا کی تفسیر کے جن مقامات کو جستہ جستہ دیکھنے کا موقع ملا ہے اس کے مطابق ہمیں تفسیر کی اساس عقل و وحی کے باہمی تلازم کے اصول پرمبنی نظر آئی ہے۔

مولانا کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ احادیث سے استدلال محققانہ انداز میں کرتے ہیں یعنی جب وہ اسے قرآن اور عقل ہر دو کے مطابق سمجھتے ہیں تو کرتے ہیں بصورت دیگر نہیں کرتے۔ یوں حدیث کے باب میں ان کا استدلال اسلوب مشرف بہ عقل و وحی ہے۔ اس طرز استدلال نے مولانا کو ہمعصر علماء اور حلقہ مفسرین میں بہت نمایاں اور ممتاز بلکہ منفرد کر دیا ہے۔

تفسیر العروۃ الوثقیٰ کی ایک لاجواب اور منفرد خوبی یہ بھی ہے کہ یہ بہت کم عرصے میں لکھی گئی ہے۔ یعنی چار سال آٹھ ماہ کے عرصے میں نو ضخیم مجلدات کا لکھنا یقینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اتنے کم عرصے میں اتنا زیادہ لکھنے کا جو ریکارڈ مولانا کے حصے میں آیا ہے۔ اس وصف میں کوئی دوسرا ان کا مد مقابل نظر نہیں آتا۔ علامہ غلام رسول سعیدی بھی بہت زود نویس مانے جاتے ہیں۔ جنھوں نے بارہ سالوں میں بارہ ضخیم جلدیں لکھ ڈالیں۔ مگر اثری صاحب نے تو علامہ غلام سعیدی کا بھی ریکارڈ توڑ دیا ہے۔

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

اس تفسیر میں بعض مقامات بہت نازک اور حساس بھی ہیں جہاں عام ڈگر سے ہٹ کر تفسیر کی گئی ہے۔ یہ وہی مقامات ہیں جنھیں مفسر کے تفردات یا امتیازات کا نام دیا جائے گا اور اس سے انکی علمی فکری اور تحقیقی مقام کو متعین کیا جائے گا اور ان کے رجحانات ذہنی و عقلی کو سمجھا جائے گا۔ بلاشبہ یہ تفسیر اس لائق ہے کہ اسکے مفسر کو سرکاری اور غیر سرکاری ہر دو سطح پر اعلیٰ پائے کے علمی و تحقیقی ایوارڈ سے نوازا جائے۔ اور ملکی جامعات میں اس تفسیر کی ضرورت و اہمیت اور دیگر معاصر تفاسیر سے تقابل کے عنوان سے اس پر پی ایچ ڈی کروایا جائے۔ خوش قسمتی سے مفسر تفسیر ہذا ابھی بقید حیات ہیں اور اپنی حیات فانی کا تہتر واں ورق پلٹ چکے ہیں۔ اور گجرات (پاکستان) میں مقیم ہیں۔ اللہ ان کا سایہ علم و فضل امت مسلمہ پر قائم و دائم رکھے (آمین)۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے یہ فقط اس تفسیر پر ایک مختصر اظہاریہ ہے۔ البتہ نقد و نظر کے ساتھ مفصل مقالہ لکھنے کی آرزو ہے۔ دیکھئے کب پوری ہوتی ہے؟ یہ تفسیر انجمن اشاعت اسلام محلہ عالیہ (رجسٹرڈ) منڈی بہاالدین یا مکتبہ الاثریہ جناح اسٹریٹ، گجرات سے منگوائی جاسکتی ہے۔ مدیراعلیٰ

مغفرت ذنب کا معنیٰ و مفہوم

ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج
استاذ الفقہ والتفسیر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

سورۂ فتح کی دوسری آیت ہے۔ لیغفرلك الله ماتقدم من ذنبك وماتاخر۔ الآیۃ۔ اس فقرہ میں حضور نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے مغفرت ذنب کی نوید دی گئی ہے اور ذنب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ زمانہ گذشتہ کے ذنب پر اور دوسرا زمانہ آئندہ کے ذنب پر مشتمل ہے۔ بالعموم ہمارے مترجمین نے لیغفر کے معنی بخشنے، معاف کرنے اور درگزر کرنے سے کیے ہیں۔ جب کہ بعض نے ڈھانک دینے اور حفاظت کرنے سے اس لفظ کا مفہوم ادا کیا ہے۔ ذیل میں ہم لیغفر کے مادہ غفر کے معنی لغت سے پیش کرتے ہیں:

المفردات میں ہے۔ ا۔ الغفر الباس ما يصونه عن الدنس ۔ کسی کو ایسی چیز پہنا دینا جس سے وہ میل وغلاظت سے محفوظ رہے۔ اس تصریح کی رو سے غفر کا معنی محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ غفر المتاع فی الوعاء، کا مطلب سامان کو کسی برتن میں ڈال کر ڈھانک دینا یعنی اس طرح اسے محفوظ کر دینا ہوتا ہے۔ اس لیے مغفرت کے معنی ہیں۔ عذاب سے محفوظ رکھنا۔ قرآن کریم میں بھی مغفرۃ کا لفظ عذاب کے مقابلہ پر آیا ہے۔

اولیك الذين اشتروا الضلالة بالهدى والعذاب بالمغفرة ۔ ۲

یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی اور مغفرت کے بدلے عذاب۔

سورۂ بقرہ میں مغفرۃ کا لفظ فقر کے مقابلہ پر بھی آیا ہے۔

الشيطان يعدكم الفقر ويامركم بالفحشاء والله يعدكم مغفرة منه و فضلا ۔ ۳

© rasailojaraid.com

شیطان تمہیں (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکنے کے لیے) فقر کا خوف دلاتا ہے۔ اور تمہیں بخل ہی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تم سے اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے۔

اس آیت کی رو سے مغفرۃ کے معنی ہیں فقر و تنگدستی اور افلاس و احتیاج سے محفوظ رکھنا۔ اسی مادہ (غفر) سے باب استفعال میں استغفار کا لفظ آیا ہے۔ جس کے بنیادی معنی ہیں حفاظت طلب کرنا۔ حفاظت طلبی کی رو سے کسی سے معافی چاہنا اور بخشش مانگنا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔

سورۂ غافر (مومن) اور سورۂ محمد میں اسی باب سے استغفر کا امر وارد ہوا ہے۔ جس کے مخاطب حضور نبی کریم ﷺ ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

فاصبر ان وعد اللہ حق و استغفر لذنبک۔ الخ۔[5]

پس آپ انتظار کیجئے بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور آپ صدور گناہ سے (اللہ کی) حفاظت طلب کرتے رہیے۔

یہاں استغفر کا معنی گناہوں سے حفاظت طلب کرنا ہے نہ کہ گناہوں کی معافی مانگنا۔ گناہوں کی معافی چاہنے کا مطلب ہوتا ہے گناہوں کا ہونا اور پھر سزا سے بچنے کے لیے بخشش چاہنا۔ ظاہر ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے لئے ثانی الذکر مطلب بیان کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ جو دوسروں کو گناہوں سے پاک کرنے تشریف لایا ہو وہ خود کیسے گناہگار ہوسکتا ہے؟ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے:

ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم ایاتہ ویزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ الآیۃ[6]

وہی ہے جس نے امی لوگوں میں انہی میں سے (عظمت والے) رسول کو بھیجا۔ وہ ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

اور ایسے ہی الفاظ متعدد مقامات پر آئے ہیں۔ دیکھئے البقرہ ۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران۔ ۱۶۴ التوبہ ۱۰۳۔ علاوہ ازیں قرآن کریم کی متعدد آیات سے عصمت انبیاء ثابت ہے۔ اس لیے اس آیت میں استغفار کے معنی سوائے صدور گناہ سے طلب حفاظت کے اور کوئی نہیں ہو سکتے۔

بقول پیر محمد کرم شاہ الازہری کے "بعض علماء نے غفر کا معنی بچالینا اور محفوظ کرلینا کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر قسم کے گناہوں سے محفوظ اور معصوم رکھا ہے۔ اس حفاظت ربانی کے باعث نہ پہلے آپ سے کبھی کوئی گناہ سرزد ہوا اور نہ آئندہ کبھی کوئی گناہ سرزد ہوگا"۔[7]

اور سورۂ محمد میں آیا ہے:

فاعلم انہ لا الہ الا اللہ واستغفر لذنبک و للمؤمنین والمؤمنت۔[8]

پس یقین رکھیے اور لوگوں پر ظاہر کرتے رہیے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور صدور گناہ سے حفاظت طلب کیجئے اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے خدا سے بخشش و معافی مانگیے۔

واضح ہو کہ استغفار کی نسبت، جب بھی انبیاء علیہم السلام کی طرف ہوگی۔ اس سے مراد ہمیشہ گناہ سے یقینی حفاظت چاہنا ہوگی اور غیر انبیاء کی طرف قرآن کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا کہ اسے طلب حفاظت کے معنی میں لیا جائے یا بخشش و معافی کے معنی میں۔

سورۂ آل عمران میں ہے:

فاعف عنھم واستغفر لھم۔ الآیۃ[9]

پس آپ ان کو معاف کردیجئے اور ان کے لیے آئندہ گناہ سے حفاظت طلب کیجئے۔

اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۵۵ میں اللہ تعالیٰ نے ان اصحاب کی بخشش و معافی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے ولقد عفا اللہ عنھم۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو معاف کردیا ہے۔ پس جس کو خدا معاف کرچکا ہو اس کے لیے استغفر لھم (دعائے معافی) کا حکم غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے معاف کرنے کے بعد دعائے معافی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس لیے آیت بالا میں استغفر لھم کا مفہوم آپ سے آپ واضح ہوجاتا ہے کہ یہاں اسے معافی اور بخشش کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا۔ دراصل یہ آیت اس امر کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ استغفار سے مراد گناہ سے حفاظت طلب کرنا بھی ہوتا ہے۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو معاف کرنے کے بعد اپنے رسول کو بھی انہیں معاف کرنے کا حکم اس لیے دیا ہے کہ ان اصحاب سے آپ ہی کے حکم کی نافرمانی ہوئی تھی۔ اس لیے انہیں آپ کا بھی معاف کرنا ضروری تھا۔ کیوں کہ اس حکم میں آپ کی تکریم مقصود تھی۔ سورۂ بنی اسرائیل (اسریٰ) میں آتا ہے: فانہ کان للاوابین غفورا۔[10]

اواب اسے کہتے ہیں جو بالارادہ بار بار خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور یہ وہ لفظ ہے جو اللہ نے اپنے نبیوں کے لیے الا یہ تمام اہل جنت کے لیے استعمال فرمایا ہے[11] ظاہر ہے کہ خدا کی طرف بار بار رجوع کرنا اس امر کو کب مستلزم ہے کہ رجوع کرنے والا گناہگار بھی ہے۔ اس لیے خدا کا غفور ہونا یہاں پر یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اواب بندوں کو گناہوں سے بچاتا رہتا ہے۔ انہیں گناہوں میں مبتلا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہونے ہی نہیں دیتا۔

خود قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال دونوں معنوں میں یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہے۔ پھر یہ امر بھی قابل حفظ ہے کہ قرآن میں جہاں بھی عفو اور غفر کا لفظ اکٹھا آیا ہے وہاں عفو ہمیشہ پہلے آیا ہے اور غفر بعد میں اور چوں کہ عفو کے معنی معاف کرنے یعنی گناہ کی سزا سے بچانے کے ہوتے ہیں۔ اس لیے عفو کے بعد غفر کے معنی گناہ سے بچانے کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتے ورنہ تکرار لازم آئے گی۔ عربی لغت کے مطابق عفو اور مغفرۃ میں فرق یہ ہے کہ غفران میں سزا قطعاً نہیں ہوتی جب کہ عفو سزا سے پہلے بھی ہو سکتا ہے اور سزا کے بعد بھی۔

عفو اور غفر کی طرح اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں بھی اپنی صفات عفواً اور غفوراً کو ایک ساتھ بیان کیا ہے۔ وہاں بھی عفواً کو پہلے غفوراً کو بعد میں رکھا ہے۔ ۱۳؎ جو اس امر کی شہادت ہے کہ قرآن مجید میں غفر اپنے معنی و مفہوم میں عفو سے بڑھا ہوا ہے۔ یعنی اگر عفو کا معنی، گناہوں کی سزا سے محفوظ کرنا ہے تو غفر کا معنی گناہوں سے محفوظ کرنا ہے اور یہی وہ لفظ ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے لیے استعمال فرمایا ہے۔

مزید تائید کے لئے ملاحظہ فاعف عنا واغفرلنا وارحمنا۔ الخ ۱۴؎

پس ہمارے (گذشتہ) گناہوں کو معاف فرما اور (آئندہ) گناہوں سے حفاظت فرما اور ہم پر رحم فرما۔

مزید یہ کہ جنت میں اہل جنت کی اس دعا کا ذکر سورۂ تحریم میں آتا ہے جس میں کہا گیا ہے۔

ربنا اتمم لنا نورنا واغفرلنا۔ الخ ۱۵؎

اے ہمارے پروردگار! ہمارے نور کو ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہماری حفاظت فرما۔

اگر یہاں واغفرلنا کا مطلب ہمیں بخش دے ہمیں معاف کر دے، سے ادا کیا جائے تو گناہوں کے ساتھ جنت میں جانا ثابت ہو جائے گا، جو ناممکن ہے چوں کہ اس آیت میں استغفار کی ضرورت، جنت میں بھی بتائی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معافی کی دعا نہیں بلکہ اپنے رب کی حفاظت میں رہنے کی دعا ہے۔ کیوں کہ جنت میں جانے کے بعد گناہوں کی بخشش اور معافی کا تصور، تحصیل حاصل ہے جب کہ حفاظت الٰہی کو پانے اور اس میں افزونی کی دعا، اس تحصیل حاصل، سے پاک ہے۔

الغرض سورۂ غافر اور سورۂ محمد کی آیات میں آپ نے دیکھا کہ حضور کے لئے استغفر لذنبک کے الفاظ آئے ہیں جو براہ راست حضور سے خطاب پر مشتمل ہیں جب کہ سورۂ فتح میں غفر کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف فرمائی ہے۔ ارشاد ہوا۔ لیغفرلک اللہ ما تقدم من ذنبک وماتاخر۔

واضح ہو کہ سورۂ غافر اور سورۂ محمد کی طرح یہاں غفر ذنب کا مطلب صدور گناہ سے حفاظت کرنا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ یہاں ماتقدم کے الفاظ بھی آئے ہیں جو ماضی کے اعمال و افعال پر دلالت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ گناہ سے حفاظت، ماضی کے اعمال و افعال پر کیسے ہو سکتی ہے؟ اس لیے اس آیت میں اس فقرہ کی وجہ سے ایسا مفہوم اخذ کرنے کی ضرورت ہے جو بیک وقت ماتقدم اور ماتاخر دونوں کے لحاظ سے درست ہو۔ نیز جو سیاق کلام اور نظم قرآن کے پہلو سے بھی ٹھیک بیٹھتا ہو۔

پھر اس آیت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ یہاں موجود لفظ ذنب کا مطلب بھی سمجھا جائے۔ ذنب کا سب سے زیادہ استعمال میں آنے والا معنی گناہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ذنب کو گناہ کے معنی میں جن مترجمین نے لیا ہے ان کی تعداد کثیر ہے۔ تاہم ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: شاہ عبدالقادر دہلوی، شاہ رفیع الدین دہلوی، ڈپٹی حافظ نذیر احمد دہلوی، محمود حسن (اسیر مالٹا) عبدالحق حقانی، خواجہ احمد الدین، ثناء اللہ امرتسری، امین احسن اصلاحی، احمد سعید دہلوی، محمد جوناگڑھی اور فتح محمد خان جالندھری۔ واضح رہے کہ ان تمام مترجمین نے ذنب کی نسبت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف کرتے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔ میں نمونے کے طور پر فقط شاہ عبدالقادر کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں:

”تا معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہوئے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے“۔ ۱۶؎

یہاں ان مترجمین کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ جنھوں نے ذنب کا ترجمہ تو گناہ سے کیا، لیکن اس کی نسبت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف نہیں کی اور وہ مترجمین یہ ہیں: احمد رضا خان بریلوی، فرمان علی (اہل تشیع)، اور ناصر مکارم شیرازی (اہل تشیع) اور نمونے کے طور پر فرمان علی کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔

”تاکہ خدا تمہاری امت کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے“۔ ۱۷؎

گناہ فارسی زبان کا لفظ ہے جو ہماری زبان اور عرف میں تلخی، شدت اور سنگینی کا حامل ہے۔ شاید اسی لیے بعض مترجمین نے ذنب کا ترجمہ بجائے گناہ کے ان الفاظ سے کیا ہے جو اپنی ظاہری صورت کے اعتبار سے گناہ کے مقابلہ میں ہلکے اور خفیف مانے جاتے ہیں۔ مثلاً اشرف علی تھانوی، عبدالماجد دریا بادی، احمد سعید دہلوی اور وحید الدین خان نے اس مقام پر ذنب کا ترجمہ خطاؤں سے کیا ہے۔ عبدالرحمٰن کیلانی نے مترادفات میں لکھا ہے کہ ”ذنب عام ہے، ہر چھوٹے بڑے گناہ کے لیے جب کہ خطا ایسا گناہ ہے جو بلا ارادہ سرزد ہو۔ ۱۸؎

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ذنب کا ترجمہ کوتاہی سے، محمد مالک کاندھلوی نے تقصیرات سے اور عبدالکریم اثری نے لغزشوں سے کیا ہے۔ اور سید احمد سعید کاظمی نے بظاہر خلاف اولیٰ کام سے اس کا مفہوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ادا کیا ہے۔

ذنب کا دوسرا معنی الزام یا تہمت ہے۔ چوں کہ جانوروں کی دم ہمیشہ ان کے پیچھے لگی ہوتی ہے اس لیے ان الزامات کو بھی ذنوب کہا جاتا ہے جو انسانوں کے پیچھے اس طرح لگے ہوتے ہیں کہ ان سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے پس وہ انسان جہاں بھی جاتا ہے اس کا الزام بھی اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ پیر محمد کرم شاہ الازہری نے اس مقام پر ذنب کا معنی الزام کیا ہے۔ ذیل میں ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''یقیناً ہم نے آپ کو شاندار فتح عطا فرمائی ہے تاکہ دور فرما دے آپ کے لیے اللہ تعالیٰ، جو الزام آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے اور جو (ہجرت کے) بعد لگائے گئے''۔١٩

نیز وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ذنب کا معنی عام طور پر گناہ کیا جاتا ہے گناہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی کو، لیکن اہل لغت لفظ ذنب کو الزام کے معنی میں بھی استعمال کرتے رہتے ہیں اور الزام میں یہ ضروری نہیں کہ وہ فعل اس شخص سے صادر بھی ہوا ہو بلکہ بسا اوقات بلا وجہ اس فعل کی نسبت اس شخص کی طرف کر دی جاتی ہے۔٢٠

اپنے معنی (الزام) کی تائید میں وہ جس آیت سے استدلال کرتے ہیں وہ یہ ہے:

ولھم علی ذنب فاخاف ان یقتلون۔٢١

ترجمہ: انہوں نے مجھ پر الزام قتل لگا رکھا ہے، پس مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

(ضیاء القرآن)

واضح ہو کہ یہاں ذنب بمعنی الزام پیش کرنے میں پیر صاحب تنہا نہیں ہیں بلکہ اس آیت میں متعدد علماء اور مترجمین کے ہاں بھی یہ لفظ (الزام) استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو احمد رضا بریلوی، مرزا بشیر الدین محمود، سید محمد محدث کچھوچھوی، غلام احمد پرویز، سید ابوالاعلیٰ مودودی، احمد سعید کاظمی، عبدالکریم اثری اور ڈاکٹر طاہر القادری کے تراجم۔ نمونے کے طور پر احمد رضا خان کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

''اور ان کا مجھ پر ایک الزام ہے تو میں ڈرتا ہوں کہیں مجھے قتل کر دیں''۔٢٢

پیر صاحب کے بقول:

ان آیات کے سیاق و سباق کو مد نظر رکھا جائے تو یہی معنی (الزام) یہاں موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ غفر کا معنی چھپا دینا، دور کر دینا، ماتقدم سے مراد ہجرت سے پہلے اور ما تاخر سے مراد ہجرت کے بعد۔

یعنی اے حبیب! جو الزامات کفار آپ پر ہجرت سے پہلے عائد کیا کرتے تھے اور جو الزامات ہجرت کے بعد اب تک وہ لگاتے رہے ہیں، اس فتح مبین سے وہ سارے کے سارے نیست و نابود ہو جائیں گے اور ان کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔

ہجرت سے پہلے جو الزامات کفار کی طرف سے حضور سرور عالم ﷺ پر عائد کیے جاتے تھے وہ یہ ہیں: یہ کاہن ہے، یہ شاعر ہے، یہ مجنون ہے، یہ ساحر ہے اور اوروں سے سن سن کر فسانے بنا دیتا ہے، اسے کوئی پڑھاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہجرت کے بعد الزامات کی فہرست کچھ یوں ہے: وہ کہتے ہیں یہ قوم میں اختلاف، انتشار پیدا کرنے والا ہے اس نے جنگ کی آگ بھڑکا کر ملک کو اجاڑ ڈالا ہے۔ بھائی کو بھائی سے اولاد کو اپنے ماں باپ سے جدا کرنے والا ہے اس نے ہمارے محفوظ تجارتی راستوں کو خطرناک بنا دیا ہے ہمارے قومی انتظامات کو درہم برہم کر دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔٢٣

پیر کرم شاہ الازہری کی اس آیت کی شرح میں جو فکر اور دلیل ہے۔ وہ اہل تشیع کی تفسیر نمونہ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ میں یہاں اس تفسیر سے چند جملے نقل کیے دیتا ہوں۔

صلح حدیبیہ نے وہ تمام الزام جن کی ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد یا اتہام تہمتیں جن کی اس ماجرے سے پہلے یہاں تک کہ وہ گناہ بھی جن کے آپ کی طرف آنحضرتؐ نسبت دینے کا امکان تھا۔ ان سب کو دھو دیا اور چوں کہ خدا نے پیغمبر کو یہ کامیابی نصیب فرمائی لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے ان سب کو دھو دیا۔

نتیجہ اس کا یہ ہے کہ یہ الزام، واقعی الزام نہیں تھے بلکہ ایسے الزام تھے جو خیالی لوگوں کے افکار میں تھے، جنہیں انہوں نے باور کر لیا تھا، جیسا کہ سورۂ شعراء کی آیت نمبر ۱۴ میں موسیٰ علیہ السلام کی داستان میں بیان ہوا ہے کہ موسیٰ نے بارگاہ خدا میں عرض کیا ولھم علی ذنب فاخاف ان یقتلون۔٢٤

پیر کرم شاہ الازہری اور تفسیر نمونہ کے موقف کے حق میں، اب مزید دلائل پیش خدمت ہیں، علماء جانتے ہیں کہ اضافت بعض وقت حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی، مثلاً سورۂ مائدہ میں آتا ہے:

انی ارید ان تبوٓء باثمی واثمک۔٢٥

''میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تو میرے (قتل کا) گناہ اور اپنا (پچھلا) گناہ (دونوں) اپنے سر رکھ لے''۔٢٦

(عبدالماجد دریابادی)

مفتی احمد یار خان نعیمی کے الفاظ میں ''اثمی میں مضاف پوشیدہ ہے۔ اصل میں اثم قتلی تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں گناہ کی نسبت ہابیل کی طرف سے ہے نہ کہ قابیل کی اور اثمک سے مراد قابیل کے پچھلے گناہ ہیں"۔[27] ظاہر ہے کہ اثمی سے مراد میرا گناہ نہیں ہے بلکہ وہ گناہ ہے جو تو میرے خلاف کرنے لگا ہے کیوں کہ اوپر اس کو قتل قرار دیا جا چکا ہے۔[28] اور اسی طرح ایک مثال سورۂ نحل میں بھی ہے۔

یقول این شرکائی الذین کنتم تشاقون فیھم۔الآیۃ۔[29]

''اور فرمائے گا کہ کہاں ہیں میرے شریک گھڑے ہوئے، جن کے لیے تم جھگڑا کرتے تھے''۔(سید محمد محدث کچھوچھوی)۔[30]

صاف ظاہر ہے کہ یہاں شرکائی کے معنی "میرے شریک" نہیں ہو سکتے۔اس کے معنی ہیں، وہ معبود جنہیں تم اپنے تئیں میرے شریک سمجھتے تھے (یا جو بزعم خویش میرے شریک بنتے تھے) لہٰذا سورۂ فتح میں ذنب کے معنی آپ پر دوسروں کے لگائے گئے الزامات ہیں جنہیں دور کرنے کی بات کی گئی ہے۔

لیغفر لک اللہ میں غفر کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے اور یہ غفر اپنے معنی و مفہوم میں ویسا ہی ہے جیسا عیسیٰ علیہ السلام کی تطہیر:

ومطھرک من الذین کفروا۔الآیۃ۔[31]

ترجمہ: تیرے منکروں (کی تہمتوں) سے تجھے پاک کروں گا۔(ابوالکلام آزاد)۔[32]

انبیاء کرام ویسے تو مطہر ہی ہوتے ہیں مگر چوں کہ ان کے مخالفین ان پر جھوٹے الزامات لگا کر ان کو نعوذ باللہ ناپاک مشہور کرتے ہیں اس لیے ان ناپاک الزامات سے ان کی بریت کا خدائی انتظام کیا جاتا ہے۔اس خدائی انتظام کو تطہیر سے تعبیر کرتے ہیں۔چنانچہ فتح مبین کا ہونا بھی ایک ایسا ہی خدائی انتظام تھا جس کی رو سے آپ کا غفر ذنب ہوا یعنی آپ کو کفار کے تمام الزامات سے پاک کیا گیا۔

ذنب کا تیسرا معنی نتیجہ (انجام) ہے۔استذنب کا معنی ہے (کسی معاملہ کا) انجام پانا۔[33]

ذناب دراصل کسی چیز کے پچھلے حصے یا دم کو پکڑنے کو کہتے ہیں۔نیز ہر اس کام کو جس کا انجام برا ہو، نیز کسی کام کے نتیجہ (انجام) کو بھی ذنب کہتے ہیں چوں کہ کسی بھی کام کا نتیجہ اس کام کا آخری حصہ ہوتا ہے،اس لیئے اسے ذنب کہہ دیا جاتا ہے اسی لیے ذنب الوادی کا معنی ہوتا ہے۔وادی کا آخری حصہ۔ ڈکشنری آف ماڈرن رٹن عربک میں ذنب کا معنی Tail اور End لکھا گیا ہے۔یعنی دم اور آخر (یعنی انجام)۔[34]

ذنب کے معنی نتیجہ (انجام) ہونے کی تائید قرآن کی اس آیت سے ہوتی ہے۔

فان للذین ظلموا ذنو با مثل ذنوب اصحابھم۔الخ (الذریات)[35]

پس جو لوگ ظلم کر رہے ہیں ان کا انجام بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ان کا ہوا جو ان کی مثل تھے۔

اس معنی (انجام، نتیجہ) کی رو سے آیت زیر بحث کا مطلب یہ ہوگا: بے شک ہم نے آپ کو واضح، روشن اور نمایاں کامیابی عطا فرمائی ہے تاکہ آپ کے گذشتہ اور آئندہ کے تمام کاموں کے انجام کی، اللہ کی طرف سے حفاظت ہو جائے (جو آپ غلبہ دین کے لیے انجام دے رہے ہیں)

واضح ہو کہ اس ترجمہ کی تائید، سورۂ فتح کے سیاق و سباق سے بخوبی ہوتی ہے۔فتح مبین کے جو نتائج بیان کیئے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔مغفرت ذنب (انجام کی حفاظت)

۲۔اتمام نعمت

۳۔صراط مستقیم کی ہدایت

۴۔زبردست نصرت

اب اگر مغفرت ذنب کا معنی گناہوں کی بخشش لیا جائے تو اس بات کا آئندہ کی تینوں باتوں سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا اور نہ ہی فتح مبین کا اس سے کوئی تعلق جڑتا ہے۔غرض اس طرح کا ترجمہ اس مقام پر بالکل بے جوڑ، بے محل دکھائی دیتا ہے۔دوسرے یہ کہ پورے قرآن میں حضور کے کسی گناہ کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔اس لیے یہ ترجمہ بجائے خود آپ کی ذات والاصفات پر ایک الزام دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح کے ترجمے پڑھنے کے بعد بعض مستشرقین نے آنحضرت ﷺ پر گناہگار ہونے کی پھبتی کسی ہے۔ جیسا کہ شاہ عبدالحق حقانی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے "بعض نصاریٰ نے معمولی گناہ سمجھ کر آنحضرت پر گناہگاری کا الزام قائم کر دیا اور اس پر طرح طرح کے برے نتائج پیدا کر لیے"۔[36]

قرآن کے علاوہ حدیث و سیرو تاریخ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اعلان نبوت سے قبل عرب معاشرہ میں پاکباز، راستباز اور فرشتہ صفت انسان مانے جاتے تھے۔لوگ آپ کو صادق اور امین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔آپ کی اعلان نبوت سے پہلے کی زندگی، خود آپ کی نبوت کی بہت بڑی دلیل تھی۔اس لیے ذنبک کے معنی آنحضرت کے گناہ، نہ تو قرآن کریم کی رو سے درست ٹھہرتے ہیں اور نہ تاریخ کی رو سے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حواشی وحوالہ جات

۱۔ المفردات فی غریب القرآن ص ۳۶۲ (کتاب العین) الناشر نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ، کراچی سنہ ندارد۔

۲۔ البقرہ ۱۷۵

۳۔ البقرہ ۲۶۸

۴۔ فحشاء کے متعدد معانی میں سے ایک معنی بخل بھی ہے۔ (المفردات، (کتاب الفاء) ص ۳۷۴) الفحش کے معنی ہیں اس نے بخل کیا۔ اس لیے بلحاظ قرینہ اس کے معنی بخل کیے گئے ہیں۔ عرب کے لوگ بخیل کو فاحش کہتے تھے (لسان العرب) اس آیت میں فحشاء کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنا۔

۵۔ الفاطر آیت ۳۰

۶۔ الجمعہ ۲

۷۔ ضیاء القرآن، جلد چہارم ص ۵۳۲ تفسیر زیر آیت، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور ۱۳۹۹ھ

۸۔ محمد ۱۹

۹۔ آل عمران ۱۵۹

۱۰۔ بنی اسرائیل ۲۵

۱۱۔ حضرت داؤد علیہ اسلام کے لیے آیا ہے واذکر عبدنا داؤد ذا الاید انه اواب۔ ص ۱۷۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے آیا ہے نعم العبد انه اواب۔ ص ۳۰۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے لیے آیا ہے انا وجدنه صابر نعم العبد انه اواب۔ ص ۴۴

۱۲۔ هذا ما توعدون لكل اواب حفيظ ۔ ق ۳۲

۱۳۔ دیکھیے سورۃ النساء ان الله كان عفواً غفوراً ۔ ۴۳۔ دیکھیے سورۃ النساء وکان الله عفواً غفوراً ۔ ۹۹۔ دیکھیے سورۃ الحج ان الله لعفو غفور ۔ ۶۰ نیز یہی الفاظ سورۃ مجادلہ ۲ میں بھی آئے ہیں۔

۱۴۔ البقرہ ۲۸۶

۱۵۔ التحریم ۸

۱۶۔ موضح قرآن، مطبع نظامی، واقع دہلی مطبوعہ پرنٹنگ ورکس، دہلی ۱۳۳۶ھ

۱۷۔ اردو ترجمہ القرآن الحکیم، ناشر حاجی محمد ابراہیم ٹرسٹ، کراچی ۱۳۹۰ھ

۱۸۔ مترادفات القرآن، ص ۷۲۵، کتب اسلام من یونیورسٹی ٹرسٹ، لاہور ۱۹۹۵ء

۱۹۔ غلام احمد پرویز کے ہاں اس آیت کا یہ مفہوم پہلے سے موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ہم نے (اے رسول) تیرے لیے کامیابی و کامرانی کی واضح راہ کشادہ کردی ہے اور ایک فیصلہ کن انقلاب عنقریب آنے والا ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ یہ مخالفین تیرے خلاف جس قدر الزامات تراشتے، بہتان باندھتے اور غلط باتیں تیری طرف منسوب کرتے ہیں (یا اس کے بعد کریں) ان کے مضر اثرات سے تیری حفاظت کا سامان ہو جائے۔ (مفہوم القرآن، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۱۹۶۱ء)۔

۲۰۔ ضیاء القرآن، جلد چہارم ص ۵۳۲

© rasailojaraid.com

۲۱۔ الشعراء ۸۲

۲۲۔ کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن، ناشر امجد واحمد رضا اکیڈمی کراچی، سنہ اشاعت درج نہیں۔

۲۳۔ ضیاء القرآن، جلد چہارم، ص ۵۳۳

۲۴۔ تفسیر نمونہ، جلد ۱۲، ص ۳۳۰، ناصر مکارم شیرازی، اردو ترجمہ سید صفدر حسین نجفی، مصباح القرآن ٹرسٹ، گنگا رام بلڈنگ، شاہراہ قائد اعظم، لاہور ۱۴۱۳ھ

۲۵۔ المائدہ ۴۹

۲۶۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور، کراچی، ڈھاکہ ۱۹۵۲ء

۲۷۔ اشرف التفاسیر المعروف بہ تفسیر نعیمی، جلد ششم ص ۳۰۳، مکتبہ اسلامیہ، مفتی احمد یار خان روڈ، گجرات سنہ اشاعت درج نہیں۔

۲۸۔ المائدہ ۷۰

۲۹۔ النحل ۴۷

۳۰۔ معارف القرآن، ناشر گورنمنٹ اسلامک مشن نیو یارک امریکہ، زیر اہتمام ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، کراچی ۲۰۰۰ء

۳۱۔ آل عمران ۵۵

۳۲۔ ترجمان القرآن، ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، انارکلی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور سنہ ندارد

۳۳۔ فیروز اللغات (عربی، اردو) فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، راولپنڈی، کراچی سنہ ندارد

۳۴۔ A Dictionary of Modern Written Arabic by Hams Wehr, P-312, OTTO Harrassowitz Wiesbaden 1961.

۳۵۔ الذاریات ۲۰

۳۶۔ تفسیر فتح المنان المشہور بہ تفسیر حقانی ص ۲۹۹ (جلد ششم) الفیصل ناشران و تاجران کتب، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور سنہ ندارد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن کی جامع اور متفق علیہ تفسیر کی ضرورت

ڈاکٹر ریحانہ فردوس
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

قرآن کا ابتدائی خطاب تمام انسانیت سے تھا اسی لیے مکی سورتیں جو مقدار کے اعتبار سے قرآن کے آدھے سے زیادہ حصے پر مشتمل ہیں اور جن کا تعلق زیادہ تر ایمان اور عقیدہ سے ہے۔ ان میں اکثر و بیشتر دنیا کے عام انسانوں کو خدا کے دین کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ مدنی سورتوں میں بھی اگرچہ احکام کا مخصوص خطاب اہل ایمان کی طرف ہے۔ لیکن ان کی عام روح تمام انسانوں کی طرف متوجہ ہے اور عمومی طور پر پورے قرآن کے اندر ہر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کتاب تمام انسانوں کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اس کا مقصد پوری نوع بشر کی ہدایت کرنا ہے۔ جس طرح آنحضرت ﷺ نے خدا کے دین کو تمام انسانوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہاں ہم یہ سوال اٹھانا چاہتے ہیں کہ کیا ہمارے مفسرین نے بھی اپنے اپنے دور میں یہی طریقہ اختیار کیا اور قرآن کی جملہ تعلیمات کو تمام انسانوں کے سامنے پیش کیا اور اس کتاب الٰہی کو انسانوں کے لیے جامع ہدایت سمجھ کر تمام دنیا والوں کے لیے مکمل تشریح و تفسیر کے ساتھ پیش کیا؟ کیا انہوں نے بھی قرآن کو اسلام کی عالمی دعوت کا اصل الاصول بنا کر انسانوں کے سامنے پیش کیا؟ کیا تاریخ کے مختلف ادوار میں مفسرین نے قرآن کی عمومی دعوت کو لے کر اس کی تشریح و تعبیر کرتے ہوئے اسلامی دنیا سے باہر کہیں کا رخ کیا؟

تاریخ کا ایک طائرانہ جائزہ لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سوال کا سو فیصد مثبت جواب دینا مشکل ہے۔ اسلام اور قرآن کی دعوت کو باقی دنیا کے سامنے پیش کرنا سب مسلمانوں کا فریضہ ہے۔

اسلامی تاریخ کی شروع کی صدیوں میں یہ کام مسلمانوں نے بہت اچھی طرح انجام دیا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ ابتدائی صدیوں میں قرآن کی زندہ تفسیریں موجود تھیں۔ یعنی یہ لوگ اپنے عمل اور سیرت و کردار سے قرآن کو دنیا کے سامنے پیش کرتے تھے۔ اسی لیے پہلی صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے اسلام متمدن دنیا کے بیشتر گوشوں میں پھیل گیا۔ اور اس کی دعوت ایک عالمی دعوت بن گئی۔ لیکن بعد کی صدیوں میں دین اور سیاست کو آپس میں اس طرح الجھا دیا کہ باقی دنیا کے لوگوں نے یہ سمجھا کہ اسلام دراصل نام ہے سیاسی اقتدار کا۔ دنیا یہ سمجھی کہ اسلام کا اصل مقصد صرف دنیا پر حکومت کرنا ہے اور دوسری قوموں پر غلبہ حاصل کرنا ہے۔ یہاں ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ سیاسی غلبہ حاصل کر کے خطوں اور ملکوں پر حکومت تو کی جا سکتی ہے۔ دلوں پر نہیں۔ جب کہ اسلام کا مقصد دلوں کو فتح کرنا تھا۔ لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شروع کی صدیوں میں مسلمانوں نے سیاسی اور ملکی فتوحات حاصل کی تھیں اسلام انہیں کے اندر سکڑ کر رہ گیا۔ اسی لیے بعد کے زمانے میں جو تفسیریں لکھی گئیں ان کا خطاب صرف ان مسلمانوں سے تھا جو اسلام کی سرحدوں کے اندر رہتے تھے۔ پھر بعد میں یہ طریقہ عام ہو گیا، اور اب تک ہمارے مفسرین اپنے وژن (Vision) کو وسیع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ آج اس روئے زمین پر مسلمانوں کی تعداد بیس فیصدی سے زیادہ نہیں اور رسول برحق کی دعوت اس کی حقانیت اور اس کی فرضیت میں کوئی فرق نہیں آیا تو سوال یہ ہے کہ یہ بیس فیصدی مسلمان یہ کیوں نہیں سوچتے کہ باقی اسی فیصدی انسانوں کو بھی اللہ کے دین میں تلقین و تبلیغ کے ذریعہ لانا ان کا دینی فریضہ ہے۔ اس بحث کی تحقیق خود اپنی جگہ پر ایک بڑا مسئلہ ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ کسی زمانے میں مسلمانوں نے پورے قرآن کو اس کی بنیادی تعلیمات کو اس کی حقیقی دعوت کو غیر مسلم دنیا کے سامنے اجتماعی اور منظم طور پر پیش نہیں کیا۔ آج اس کام کی جتنی ضرورت ہے۔ شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ آج کا انسان اخلاقی و روحانی طور پر نہ صرف حد سے زیادہ بھٹکا ہوا ہے بلکہ وہ اپنی روحانی تشنگی کے لیے سرگرداں اور متلاشی بھی رہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آج شر و فساد کے طوفان میں وہ کیسے زندہ رہے۔ کہاں سے ہدایت حاصل کرے۔ ایسے میں کاش ہمارے مفسرین حضرت محمد ﷺ کی عالمی دعوت کو پھر سے دنیا کے سامنے پیش کرنے کی سعی کریں۔ کیا یہ وہی کتاب الٰہی نہیں کہ جس نے تئیس برس کی قلیل مدت میں عرب میں ایک زبردست اخلاقی اور روحانی انقلاب برپا کیا تھا۔ آج دنیائے اسلام جس طرح اپنے مسائل میں گھری ہوئی ہے۔ اور وہ صرف اپنے ہی مسائل کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ اسی طرح دین اسلام کا تعلق بھی صرف مسلمانوں سے رہ گیا ہے۔ وہ اپنے ہی اندر ایک دوسرے سے الجھتے رہتے ہیں۔ انہیں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ اپنے حالات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درست کر کے اس عالمی فریضے کی طرف بڑھیں جس کی طرف قرآن نے ان کو مستقل دعوت دی ہے۔

کیا قرآن کے مرکزی تصورات کو کسی نے مربوط انداز میں پیش کیا ہے؟

قرآن کے مطالعے کے سلسلے میں یہ بات بے حد اہم ہے کہ ہمیں پہلے یہ معلوم ہو کہ اس کے اندر بنیادی اور اساسی وہ کون سے تصورات ہیں جن پر خدا کے دین کی عمارت کھڑی ہے۔ اور پھر یہ معلوم ہو کہ مجموعی طور پر قرآن کی تعلیمات اور ہدایت کا اصل مقصد کیا ہے؟ اور وہ کون سے بنیادی امور ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور اپنی کتاب کے ذریعہ انسانوں کی رہنمائی اور ہدایت فرمائی ہے؟

ان چیزوں کا تعین اس لیے ضروری ہے کہ قرآن کوئی ادب اور فلسفے کی کتاب نہیں۔ بلکہ وہ کتاب ہدایت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں جو بھی ہدایت ہوگی وہ اتنی جامع، واضح اور قابل عمل شکل میں ہوگی کہ جس کا احاطہ کرنا ایک عام انسان کے لیے آسان اور ممکن ہو۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ یوں تو قرآن میں بہت سے مضامین بیان ہوئے ہیں۔ جن کا تفصیلی تذکرہ تفسیروں میں ملتا ہے۔ لیکن دراصل قرآن کے اندر صرف چند بنیادی علوم بیان کیے گئے ہیں۔ اور ان کے علاوہ قرآن کے اندر جو کچھ کہا گیا ہے وہ انہیں امور کی تشریح وتفصیل ہے اور وہ یہ امور ہیں:

۱۔ عقائد۔

۲۔ خیر وشر کی تمیز۔

۳۔ ہدایت الٰہی کی ضرورت۔

۴۔ انسانوں کی ہدایت کے لیے اور ان کو اللہ کا حقیقی منشاء جاننے کے لیے نبی ورسول کی ضرورت۔

۵۔ ایک صالح معاشرے کی تشکیل اور اس کے لیے ضروری احکامات۔

۶۔ تمام انسانوں کو اللہ کی ہدایت کی طرف دعوت اور ان کو ایک ایمانی اور اخلاقی وحدت میں لانے کا ارادہ اور منصوبہ۔

۷۔ عدل کا قیام۔

یہ ہیں وہ بنیادی مسائل جن کا تذکرہ قرآن میں بار بار آیا ہے۔ کہیں تفصیل سے اور کہیں اجمال سے۔ انہیں مقاصد کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کہیں تو اپنی بے شمار نعمتوں کا ذکر کیا ہے اور انسان پر اپنے انعامات اور احسانات کا۔ اور کہیں یہ فرمایا ہے کہ اس نے خود انسان کے نفس میں اور اس کے باہر یعنی آفاق میں بھی اپنی بے شمار نشانیاں رکھی ہیں۔ جن کو دیکھ کر وہ اپنے رب اور خالق کی حقیقت اور عظمت سے واقف ہو سکتا ہے۔ اور خوشی سے اس کی طاعت وبندگی قبول کر سکتا ہے۔ اور

کہیں گذشتہ اور نافرمان قوموں کے عبرت ناک انجام کا تذکرہ کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ اس نے تمام کائنات اور انسانوں کے لیے ایک قاعدہ مقرر کیا ہے۔ جو اس کی حکمت ودانائی پر مبنی ہے۔ اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس لیے کوئی انسان یا انسانی گروہ اگر اللہ کی سنت کو چھوڑ دے تو اس کا وہی انجام ہوگا جو پہلی قوموں کا ہو چکا ہے۔ پھر اس نے تمام انسانوں سے یہ فرمایا ہے کہ ہمارے احکامات، ہمارا ارادہ اور منشا جاننے کے لیے ضروری ہے کہ تم انبیاء علیہم السلام کی طرف رجوع کرو اور ان کی پیروی کرو۔ تاکہ احکام کی اصل روح اور حقیقت تم پر واضح ہو۔

قرآن کے ان بنیادی مقاصد کی تعلیم اور ان تمام جزوی باتوں اور احکام کا مقصد اولاً یہ ہے کہ دنیا میں انسان ایک اچھا، نیک اور عادل معاشرہ قائم کریں۔ اور اس کے اندر رہ کر اللہ کی طاعت وبندگی کا صحیح مظاہرہ کر سکیں۔ اور اس طرح دنیاوی زندگی میں اپنے انفرادی اور اجتماعی حالات کو درست کر سکیں اور ثانیاً جب اس دنیا سے دوسری دنیا میں جائیں تو وہاں بھی ان کی سعادت اور خوشی کا سلسلہ جاری رہے۔ اور جس طرح وہ اس دنیا میں اللہ کی عنایات کے مستحق ہوتے تھے اسی طرح دوسرے عالم میں بھی اسی کے مستحق ہوں۔ قرآن میں بہت سے جزوی مسائل ہیں جن کا تعلق انہیں بنیادی امور سے ہے جن کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا ہے۔ عام طور پر تفسیروں میں یہ باتیں الگ الگ تو بیان ہوتی ہیں مگر ان جزئیات کو ان کلیات سے مربوط کر کے بیان نہیں کیا جاتا۔ جس کی وجہ سے مختلف تفسیروں کو پڑھنے کے بعد یہ تاثر قائم نہیں ہوتا کہ کتاب اللہ کے یہ واضح اور متعین مقاصد ہیں۔

پھر ان مرکزی تصورات کو اس طرح بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ تمام دنیا کے لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں اور سمجھیں کہ یہ دعوت اللہ کی طرف سے آئی ہے۔ جیسا کہ قرآن نے اعلان کیا کہ ان ھو الا ذکر للعالمین۔ یہ ہدایت الٰہی سارے انسانوں کے واسطے ہے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی فرمایا کہ ہم نے محمد ﷺ کو سارے عالموں کے لیے رحمت اور بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے۔ قرآن کی دعوت کو عالمی دعوت بنا کر پیش کرنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اہل عالم کے سامنے پیش کیا جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نبی رحمت ﷺ کی سیرت کو بھی اس کے اصلی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اسلام کی دعوت کو دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے تو یہ دونوں کام از سر نو کچھ اصول وضوابط طے کر کے دوبارہ کرنے چاہییں۔ ایسی تفسیریں جو صرف مسلمانوں کے لیے لکھی گئی ہوں اس فریضہ کو ادا نہیں کر سکتیں۔ مفسرین کو دنیا کے حالات اور تمدن عالم کے مسائل کو پیش نظر رکھ کر قرآن کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تفسیر بیان کرنا ہوگی۔ قرآن کے مرکزی اور اساسی تعلیمات پر مفسرین کا اتفاق انتہائی ضروری ہے۔ موجودہ تفسیروں میں جو انتشار پایا جاتا ہے اسے دور کرنا بے حد ضروری ہے۔ علمائے مفسرین اس اتفاق کو ایک جامع تفسیر کی شکل میں پیش کریں جس کا سمجھنا سب کے لیے آسان ہو اور یہ معلوم ہو کہ جملہ طور پر زندگی کے حقائق اور مسائل کے بارے میں قرآن کی یہ تعلیمات ہیں۔ ضروری نہیں ہر مسئلے پر سب کا اتفاق ہو۔ لیکن بنیادی مسائل پر تو اکثریت کا اتفاق ہو سکتا ہے اور یہ اسلام کی عالمی دعوت کے لیے ضروری بھی ہے۔ اس کے نہ ہونے سے تاریخ میں اسلامی معاشرہ ہمیشہ انتشار کا شکار رہا۔ مختلف مذاہب تفسیر پیدا ہوئے اور قرآن کی متضاد تفسیریں لکھی گئیں۔ لہٰذا اس سے اسلام کا اصل پیغام نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ علماء کی ایک بڑی جماعت ایک ساتھ بیٹھ کر قرآن کے معانی اور احکام پر غور کرے اور ان کی روشنی میں قرآن کی ایک مشترکہ تفسیر تیار کرے۔ اس سے نہ صرف مسلمانوں کو فائدہ ہوگا بلکہ غیر مسلموں کو بھی اسلام کی دعوت کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ مغرب میں بائبل کے متعلق کئی بار اس طرح کا کام ہو چکا ہے۔ اگرچہ وہاں عیسائی فرقوں کی تعداد ان گنت ہے۔ اس کے باوجود وہاں کے لوگ کتاب مقدس کے جملہ احکام اور اس کی ہدایات کے بارے میں بڑی حد تک متفق ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ عیسائی مبلغین اس کتاب کو لے کر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئے ہیں اور اس کی تعلیم سے کروڑوں انسانوں کو عیسائیت کے دائرے میں داخل کر لیا ہے۔ لیکن مسلمان تو خود اپنی کتاب پر متفق نہیں ہیں۔ تو وہ دوسروں کو اس کی تبلیغ کیسے کریں گے۔ مثلاً ایک ظاہری تفسیر ہے اور ایک باطنی دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ دونوں باتیں عام انسانوں کے سامنے کیسے پیش کی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح ایک خالص روایتی تفسیر ہے جو احادیث اور آثار پر مبنی ہے مگر اس میں حد درجہ اختلاف رائے ہے۔ اس تفسیر کو آج کس طرح سمجھا جائے۔ اسی طرح مختلف زاویوں سے تفسیریں لکھی گئیں جو اکثر ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ ان تالیفات سے قرآن کو سمجھنے میں مدد کم ملتی ہے رکاوٹ زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ایک بات بالکل واضح ہے کہ دنیا کا ہر مسلمان چاہتا ہے کہ قرآن کے تمام ارشادات اور اس کی ہدایات کو ایسی زبان ایسے پیرائے میں بیان کیا جائے جو سمجھ میں آئے تاکہ اس پر عمل بھی ہو سکے۔ یہ کام ہر دور میں ہو سکتا تھا اور آج بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اسلام کی پوری تاریخ میں ایک مرتبہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی ایک تفسیر ایسی تیار کی گئی ہو جس پر سب متفق ہوں۔ ہمارے نزدیک یہ قرض امت مسلمہ پر ابھی تک باقی ہے۔ وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھے اور قرآن کی ایک جامع اور متفق علیہ تفسیر دنیا کے سامنے پیش

کرے۔

کیا قرآن آج بھی تمام انسانوں کو کامل ہدایت مہیا کر سکتا ہے؟

اس بات میں مسلمان دو رائے نہیں رکھتے کہ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ اور جو ہدایت ایک فرد یا ایک قوم کے لیے ضروری اور کافی ہوگی۔ وہی دوسرے افراد اور اقوام کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔ ہدایتیں مختلف قسم کی نہیں ہوتیں۔ ہدایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ اور یہی ہدایت وہی ہے جو خدا کی طرف سے ہو اور اس کے انبیاء کے ذریعہ انسانوں تک پہنچی ہو۔ جب قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کو تمام عالم کی طرف نبی بنا کر بھیجا اور فرمایا: وما ارسلنک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا۔ (28:34) اے محمد ﷺ ہم نے تمہیں تمام انسانوں کے واسطے خوشخبری سنانے والے، ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور فرمایا: وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین۔ (107:21) اور ہم نے تمہیں تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ تو اس سے خدا کا منشا ظاہر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ ہدایت جو اس نے اپنے نبی کے ذریعے دنیا میں بھیجی ہے وہ تمام عالم کے لیے کافی ہے۔ اور چونکہ آنحضرت خاتم النبیین ہیں۔ ان پر دین کی تکمیل ہو گئی۔ اور آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنی نعمت کو مکمل کر دیا۔ تو یہی مکمل دین اور یہی مکمل نعمت ہر دور ہر زمانے اور ہر جگہ کے انسانوں کے لیے کافی ہوگی۔ انسان خواہ آنحضرت ﷺ کے دور کا ہو یا بعد کے دور کا ہو۔ اور دنیا کے کسی خطے کا اس کو ہدایت صرف یہیں سے مل سکتی ہے۔ اور جب خدا کا دین کامل ہو گیا تو یہ ہدایت بھی ہر پہلو سے کامل ہدایت ہے۔ اس سے باہر ہدایت تلاش کرنا صرف گمراہی ہے۔

مختصر یہ کہ آج بھی دین اسلام تمام دنیائے انسانیت کی اخلاقی، دینی رہنمائی کر سکتا ہے اور اس کے دامن کے علاوہ انسانیت کو کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ پھر جب ہم اس ہدایت کے اساسی اصولوں پر غور کرتے ہیں۔ تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ہدایت تو صرف یہی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان الدین عند اللہ الاسلام۔ کہ دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ اس ہدایت کے وہ بنیادی عناصر کا ذکر ہم نے اوپر کیا۔ کچھ اور پہلو یہاں بیان کرتے ہیں، جن سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ ہدایت کس طرح آج بھی تمام انسانیت کے لیے بہترین ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات تو یہ ہے کہ محض زبانی اور علمی طور پر کوئی ہدایت موثر نہیں ہو سکتی جب تک اس کا عملی نمونہ سامنے نہ ہو اور زندگی کے عام حالات میں اس کی تصویر نظر نہ آئے اس کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کو دنیا میں بھیجا۔ آپ ﷺ نے ایک طرف تو خدا کی کتاب اور دین کی علمی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زبانی تو ضیح فرمائی۔ اور دوسری طرف اپنے عمل اور سیرت سے اس کا مفہوم واضح کیا۔ اور انسانوں کے لیے بہترین انسانی نمونہ پیش کیا۔ اور یہی وہ نمونہ ہے جو نہ صرف ملت مسلمہ کی وحدت کا راز ہے۔ بلکہ یہی وہ معیار ہے جس پر تمام انسانیت متحد اور متفق ہو سکتی ہے۔ کیونکہ خیر اور اخلاق کا دنیا میں سب سے اچھا نمونہ وہی ہے جو آنحضورؐ نے پیش کیا۔

لہٰذا اگر وہ اس نمونہ کو اختیار کریں تو یقیناً ان کو وہ سعادت اور اطمینان مل سکتا ہے۔ وہ روحانی تسکین حاصل ہو سکتی ہے۔ جس کی دنیا ہمیشہ سے پیاسی رہی ہے اور آج بھی ہے۔ اس ہدایت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس دنیا میں خوش آئند زندگی گذارنے کے کچھ احکامات دیے ہیں جن پر عمل کر کے وہ نیکی اور عدل کی زندگی گذار سکتے ہیں۔ یہ عادلانہ زندگی دراصل اخروی سعادت اور فلاح کی ضمانت ہے۔ اسی کو اسلام کی زبان میں عقیدہ آخرت کہا گیا ہے۔ جب تک انسان کے سامنے جوابدہی کا یہ تصور نہ ہو اس سے تمام تر خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی ۔ اس عقیدہ پر تمام دنیائے انسانیت کو جمع کیا جا سکتا ہے۔

ان تصورات کے ساتھ اسلام نے معاشرہ انسانی کے لیے کچھ قدریں بھی دی ہیں۔ انہیں میں سے ایک وحدت انسانیت کا نظریہ ہے۔ اس تصور کو قرآن نے بہت زور سے پیش کیا ہے۔ اس کی مثال دنیا کے کسی مذہب اور کسی تمدن میں نہیں ملتی۔ قرآن میں بار بار آیا ہے کہ اللہ نے تمام انسانوں کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا ہے۔ اور ان کو ایک ہی دین کے تابع رکھا تھا۔ لیکن بعد میں انہوں نے اپنے جداگانہ طرز زندگی اختیار کر لیے۔ مختلف گروہوں میں بٹ گئے مگر اسلام کی دعوت آج بھی یہی ہے۔ اگر تمام دنیا اس خالص دین پر مجتمع ہو جائے جس پر وہ ابتداء میں تھی۔ تو قوموں اور ملکوں کے جھگڑے بڑی حد تک مٹ سکتے ہیں۔ اگر نہ بھی مٹیں تو ذہنی اور جذباتی طور پر دنیا کے انسان یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ وہ ایک ہی نسل اور ایک ہی امت کے افراد ہیں۔ اور یہ اپنی جگہ خود ایک نعمت ہے۔

انسانی معاشرے کی صحت وخوشحالی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک تصور اور دیا ہے کہ انسان ہونے کے ناطے تمام انسان برابر ہیں۔ رنگ نسل اور قومیت کی کوئی اصل نہیں اور اسلام اس کا کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ اگر ان تعصبات کا خاتمہ ہو جائے تو بڑی حد تک دنیا کے انسان ایک ہو جائیں۔ بہت سے مسائل حل ہو جائیں اور بین الاقوامی تعلقات کے بہت سے مسائل اور مشکلات آسانی سے حل ہو جائیں۔ اور اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک اور قیمتی اصول "اخوت" کا دیا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کے دین میں شریک ہوں تو وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یعنی دین کی وحدت سے ایک ایسا رشتہ پیدا

ہو سکتا ہے جو تمام دوسرے انسانی رشتوں سے زیادہ مضبوط ہو سکتا ہے۔ جب تمام انسان خدا کے دین کو قبول کر کے رشتہ اخوت میں منسلک ہو جائیں تو ان کو نہ صرف باہمی تقویت اور خوشی حاصل ہوگی بلکہ دنیا سے شر اور فساد بھی مٹ جائے گا۔ یہ سب خیالی باتیں نہیں۔ بلکہ تاریخ کے ایک وسیع دور میں ان قدروں پر عمل ہو چکا ہے۔ اور آج بھی دنیا میں یہ قدریں زندہ ہیں۔ اس لیے ہدایت کی یہ تصویر قرآن کی تفسیر کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کی جائے تو وہ دنیائے انسانیت کے لیے یکساں مفید ہو سکتی ہے۔ یقیناً اسلام ہی دین انسانیت ہے اور اسی کے ذریعہ دنیا کو کامل ہدایت مہیا کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا خدا کی کتاب ہدایت یعنی قرآن مجید کو دنیا کے لوگوں کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ دنیا کے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ یہ مسلمانوں کا قرآن ہے بلکہ یہ سمجھیں کہ یہ ہمارا قرآن ہے۔

قرآن مجید کے آٹھ
منتخب اردو تراجم کا تقابلی جائزہ
(تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی)
ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج
صفحات: ۲۶۳
قیمت: ۳۰۰ روپے
ناشر: دار التذکیر،
رحمن مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ،
لاہور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اہل ہند پر "صابئین" کا اطلاق

محمد اعظم سعیدی
مہتمم جامعہ اسلامیہ کورے وال ٹرسٹ

ان الذین امنوا والذین ھادوا والنصری والصبئین من امن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ج ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔

ترجمہ۔ بیشک اہل ایمان اور جو لوگ یہودی ہیں اور نصاریٰ اور صابئین ہیں (ان میں سے) جو شخص بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور عمل صالح کیے تو ان کے لئے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (سورۃ بقرہ آیت ۶۲)

اس آیت مبارکہ کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ جو مسلمان ہیں، یہودی، نصرانی اور صابئین ہیں ان میں سے جو بھی اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان لائے گا ان کے اس عمل کا اجر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے مگر اس آیت میں میرا موضوع تحقیق صرف صابئین ہیں کہ یہ قوم کون سی قوم ہے؟ اس کا مسکن کہاں ہے؟ یہ قوم کس مذہب کی پیروکار ہے؟ اس کا شمار اہل کتاب میں ہے یا مشابہ اہل کتاب میں ہے یا یہ محض تخیلات کے پیروکار ہیں؟

قرآن مجید میں کئی ایک بڑی بڑی معروف قوموں کے نام موجود ہیں جن میں سے چند ایک ایسے نام بھی ہیں جن کے بارے میں ہمارے مفسرین ومورخین تا حال یہ حتمی فیصلہ نہیں کر سکے کہ یہ کون سی قومیں ہیں ان میں سے ایک صابئین ہیں، یہ قوم بہت بڑی قوم تھی اور قرآن مجید نے بھی اس منفرد قوم کا مسلمانوں، یہود اور نصاریٰ جیسی بڑی قوموں کے ساتھ ذکر کر کے اسے ایک اہم قوم قرار دیا ہے چنانچہ صابئین کو بھی ان تینوں قوموں کی طرح ایک بڑی مذہبی قوم کی حیثیت سے ہونا چاہیے۔ مگر ہمارے محققین، مفسرین، محدثین، مورخین اور فقہاء عظام نہ صرف اس قوم یا امت کا متفقہ دائرہ متعین نہیں کر سکے بلکہ اپنے مختلف فیہ اقوال کے باعث صابئین کی شناخت کو مزید دھندلا گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ اب قاری کا حقیقت تک پہنچنا مشکل تر ہو گیا ہے ان مختلف فیہ اور غیر تحقیقی اقوال کی ایک جھلک ملاحظہ ہو

حضرت حسن بصری صابئین کو ملائکہ پرست قرار دیتے ہیں۔[1]

بقول فقیہ ابو اللیث سمرقندی، امام ابو یوسف اور امام محمد انہیں فرشتوں کا پجاری قرار دیتے ہیں۔[2]

مجاہد کا ایک قول یہ ہے کہ صابئین کا کوئی دین نہیں ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ یہودیوں اور مجوسیوں کے درمیان کی ایک قوم ہے۔[3]

خلیل کا قول یہ ہے کہ صابئین کا دین نصاریٰ کے دین کے مشابہ ہے مگر یہ قوم حضرت نوح کے دین پر ہونے کی دعویدار ہے۔[4]

علامہ محمود آلوسی فرماتے ہیں کہ روم کے صابئین ستارہ پرست ہیں جبکہ ہندوستان کے صابئین بت پرست ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ صابئین بت پرست نہیں بلکہ یہ لوگ ستاروں کی اس طرح تعظیم کرتے ہیں جیسے ہم کعبہ کی تعظیم کرتے ہیں نیز ایک قول یہ ہے کہ یہ لوگ موحد ہیں اور ستاروں کی تاثیر کا اعتقاد رکھتے ہیں۔[5]

شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی، علامہ قرطبی کے حوالے سے رقمطراز ہیں۔ اسحاق نے کہا صابئین اہل کتاب کا ایک فرقہ ہیں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا کہ ان کا ذبیحہ کھانے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[6]

علامہ بیضاوی نے بھی ایک قول نقل کیا ہے کہ صابئین ستارہ پرست ہیں۔[7]

ابو العالیہ کہتے ہیں کہ صابئین زبور کر پڑھنے والا اہل کتاب کا ایک فرقہ ہے۔[8]

علامہ شامی لکھتے ہیں قہستانی کا قول یہ ہے کہ صابئین کا ذبیحہ حلال ہے کیونکہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اقرار کرتے ہیں اور بدائع میں مذکور ہے کہ صابئین زبور کو اپنی کتاب مانتے ہیں اور ممکن ہے ان کے بہت سے فرقے ہوں۔[9]

مولانا حسین علی واں بھچراں ابن کثیر کے حوالے سے لکھتے ہیں والصابئین یہ لوگ بھی اہل کتاب ہی کا ایک گروہ ہیں فرقۃ من اہل الکتاب۔[10]

مولانا محمد احمد اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں اور صابئین، مراد وہ فرقہ ہے جو ستاروں کی عبادت کرتے تھے یا فرشتوں کو پوجتے، ایران کے قدیم آتش پرستوں کو اور ہندوستان کے قدیمی بت پرستوں کو اسی فرقہ کی شاخیں ہونا بتلایا گیا ہے۔[11]

ہمارے مفسرین وفقہاء کے مذکورہ اقوال سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ صابئین ملائکہ پرست یعنی

© rasailojaraid.com